خواتین کی دینی تعلیم: روایت، مسائل اور عصری تحدیات

Religious Education for Women: Tradition, Issues & Challenges

ڈاکٹر آسیہ شبیر*

Abstract:

The role of madaris in spreading Islamic knowledge is an admitted fact. This blessed effort started from Dar-e-Arqam (Makkah) and Suffa (Madinah) as very first Islamic institutions. The role of madaris in producing scholars has been vital. In Islamic world, some universities and madaris got great repute. These institutions have splendid history and valuable tradition of teaching Quran and Sunnah. Along with this, madaris went through reforms time by time. There is a widespread criticism on these institutions. This is a result of sincere concern but most of the times, of mere propaganda and stereotypes. Women madaris certainly are in need of radical reforms to meet the challenges of modernity and globalization. Changing role of women requires a paradigm shift in curricula, teaching methods and training methodology. This article "Balancing one's rights and responsibilities" is an effort to identify some of the contemporary needs of the Muslim women's education and curricula. This is the way Muslim women can attain their dynamic role in society by adopting reforms to meet the challenges of the day.

Keywords: Women Education, Issues, Muslim Society

جہالت اور بے خبری سے نکلنے کے لئے علم کا حصول فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلام اس حوالے سے مرد اور عورت میں امتیاز نہیں برتتا۔ بلکہ نور علم ایک ایسی ضرورت ہے کہ جس کے لیے رسول اکرم

* اسسٹنٹ پروفیسر، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، جیل روڈ، لاہور

صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف تاکید فرمائی بلکہ مردوں کے ساتھ خواتین کی تعلیم وتربیت کے لیے خصوصی اہتمام فرمایا کرتے۔ امہات المومنین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تعلّم اور تفقّہ کا شرف پایا جبکہ صحابیات نے براہ راست آپ سے سنا اور سیکھا اور امہات المومنین سے بھی استفادہ کیا۔ بعدازاں خواتین میں تعلیم و تعلّم کی یہ روایت انہی کے توسط سے جاری اور ساری رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ علم، انسانیت کے لیے تحفہء ربانی ہے۔ قرآنِ وحی کا آغاز ہی قلم وقرطاس کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ (اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ)۔ [1] یہی دیگر مخلوقات پر اس کی وجہ فضیلت ہے۔ مذاہب عالم اور تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں یہ بلند پایہ اعزاز صرف اسلام کو حاصل ہے کہ علم اور اس کی تعبیر وتشریح نہ تو یونانیوں کی طرح کسی طبقے کی میراث رہی مثلاً اشرافیہ، نہ اس پر کسی نسلی گروہ کا اجارہ قائم ہوا جیسے برہمن اور بنی لاوی اور نہ کلیسا کی انجمن (Church Council) اور پاپائیت جیسا ادارہ یہاں پنپ سکا۔ [2]

اقرأ کے اولین پیغام کے ساتھ ہدایتِ الٰہی کے جس آخری اور تکمیلی منصوبہء عمل کا آغاز ہوا، اس میں علم کا سحابِ رحمت کمزوروں، غلاموں، مردوں اور عورتوں، عرب اور عجم پر یکساں برسا۔ وہ طبقات، جو انسانی تاریخ میں ہمیشہ پس ماندہ رکھے گئے تھے، انھیں جب اپنی صلاحیتوں کے آزادانہ اظہار کا موقع ملا تو تاریخ کے صفحات پر کتنے ہی کارہائے نمایاں ثبت کر گئے۔ علم کے ہر شعبے میں غلاموں نے وہ کمال پایا کہ اس حوالے سے دریافت کرتے کرتے ایک اموی خلیفہ چلّا اٹھا، کہ کیا عرب ماؤں نے اہل علم جننے بند کر دیے ہیں۔ [3] "غلاموں کے علاوہ طبقہء نسواں بھی اس حوالے سے بڑا نمایاں ہوا۔ خواتین بڑی تیزی سے علمی میدان میں آگے بڑھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ حوصلہ دیا کہ وہ اپنی جداگانہ حیثیت کی مالکہ ہیں اور طلبِ علم کا ویسا ہی حق رکھتی ہیں جیسا کہ مرد۔ [4] یہی وجہ ہے کہ جمعہ وعیدین کے خطابات سننے اور مسجد کی نمازوں میں شرکت کرنے کے علاوہ بھی ان کی حصول علم کی کاوشوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ وہ مردوں کے دروس کی سامع ہوتیں۔ خود اپنے حلقہ ہائے درس قائم کرتیں جن میں صرف خواتین شریک ہوتیں اور بعض اوقات مرد بھی ان کے مستقل شاگرد ہوتے یا کسی خاص معاملے میں ان سے استفسارات کرتے اور حتیٰ کہ فتویٰ طلب کرتے۔ [5]

دینی تعلیم کی روایت میں امّہات المومنین کا کردار:

امہات المؤمنین اس نسائی علمی تحریک کی قائد تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات، معاشرت، عائلی زندگی، باہمی تعلقات اور اخلاق وآداب کے بارے میں معلومات کا بڑا حصہ ان بلند مرتبہ

خواتین کے واسطے سے امت کو ملا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں مشہور گواہی دی تھی کہ کان خلقه القرآن۔[6] اس کے علاوہ بھی عالمِ نسواں کے خصوصی مسائل اور ان کی جذباتی کشمکش میں توازن قائم کرنے کے حوالے سے بعض بڑے اہم سبق انہیں جلیل القدر خواتین سے روایت ہوئے۔ امہات المؤمنین صرف کثرت سے روایت کرنے والوں ہی میں شامل نہیں، بلکہ انھوں نے خواتین کے علاوہ مردوں کے لیے بھی تفقہ اور تدبر کی مثالیں قائم کیں۔[7] دنیا کی مذہبی روایت کا سرسری مطالعہ رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ یہاں بس "روایات" کافی سمجھی جاتی ہیں۔ کسی روایت کی "معقولیت" کا سوال مذہبی ادب کی تاریخ میں کم ہی اٹھایا گیا لیکن امہات المؤمنین کے ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن عمر جیسے صحابی کی روایت کو قبول نہیں کیا جب انھوں نے یہ فرمایا کہ میت پر بین کرنے سے مرنے والے کو عذاب ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ غلط بیان کرتے ہیں نہ اپنے پاس سے گھڑتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ سماعت بھی تو خطا کر سکتی ہے۔ اس روایت کے معنی کھول کر بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ اس مرنے والی کو عذاب ہو رہا ہے اور اس کے گھر والے اس کے دنیا سے رخصت ہونے پر رو رہے ہیں۔[8]

مسلم تاریخ کے بعد کے ادوار میں بھی خواتین کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ وہ مفسّرات و محدّثات تھیں۔ فقہ اور اصول فقہ کی ماہر تھیں۔ شاعری، ادب، تاریخ اور طب، ہر میدان میں انھوں نے اپنی مہارت کے جھنڈے گاڑے۔ مکہ ومدینہ ہو یا شام اور کوفہ، بغداد اور اندلس ہوں یا برّصغیر، مسلم خواتین کی علمی تگ وتاز ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔

پاکستان میں دینی تعلیم وتدریس کی روایت:

برّصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کے عرصہ حکمرانی کے دوران خواتین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا لیکن خواتین کے علیحدہ مدارس یا اقامتی مدارس کم از کم اس خطے میں بہت پرانی روایت نہیں رکھتے۔ مردوں کے لیے ایسے قدیم مدارس بھی بہت تھے اور بعد میں اصلاحات اور ترامیم کے ساتھ بھی بہت سے مدارس نے فروغ پایا مثلاً دیوبند، ندوۃ العلماء، مدرسہ الاصلاح وغیرہ۔ اگرچہ خواتین کے لیے سکول اور کالج انگریزوں کے دور میں شروع ہو گئے تھے اور قیام پاکستان کے بعد بھی تسلسل سے قائم ہوتے گئے، لیکن اقامتی دینی مدارس میں بہت بعد میں بننا شروع ہوئے۔ ۱۹۸۰ کی دہائی میں خواتین کے دینی مدارس کے قیام کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا اور اگلی دو دہائیوں میں اس سلسلے میں بہت تیزی دیکھنے میں آئی۔ مدارس کے وفاق بنے، رجسٹریشن اور باقاعدہ ڈگریوں کا نظام بنا۔

پاکستان میں دینی مدارس کے پانچ وفاق boards ہیں جن سے سینکڑوں مردانہ وزنانہ مدارس منسلک ہیں۔ وفاق المدارس السّلفیہ ،اہل حدیث مدارس کا وفاق ہے۔ وفاق المدارس العربیہ اور تنظیم المدارس بالترتیب دیوبندی اور بریلوی مکتب فکر کے نمائندہ ہیں۔ وفاق المدارس الشیعہ اہل تشیع مدارس کا بورڈ ہے۔ رابطۃ المدارس الاسلامیہ جماعت اسلامی کا نمائندہ وفاق ہے جو مسلکی تفریق کے بغیر قائم کیا گیا ہے۔ ۲۰۱۴ میں کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق ان تمام وفاقوں سے وابستہ رجسٹرڈ مدارسِ طالبات کی تعداد ۶۵۴۷ ہے۔[۹] ہزاروں بچیاں یہاں حفظ، ناظرہ اور مختلف درجات کی دینی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ مدارس میں صرف غریب بچیوں کے علاوہ اب آسودہ حال گھرانوں کی بچیاں بھی تعلیم حاصل کررہی ہیں گو کہ ان کی تعداد دس سے بیس فیصد کے درمیان ہے۔[۱۰]

ا۔ مدارسِ دینیہ کی فقید المثال خدمات:

دینی مدارس بچوں کے ہوں یا بچیوں کے، برصغیر کے خصوصی تناظر میں ہر محب وطن اور محب دین انھیں "اسلام کا قلعہ " کہتا ہے۔ اس "خطاب" کی ایک تاریخ ہے۔ برصغیر پر انگریزوں کے قبضے کے بعد، جب مسلمانوں کے ہاتھوں سے حکومت نکل گئی تو یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ مسلمان، ہندوستان میں ہمیشہ سے اقلیت تھے۔ سلطنت اور حکومت کی قوت ان کے لیے دینی، سیاسی اور معاشرتی ہر اعتبار سے مضبوط ڈھال تھی۔ برطانوی راج میں عربی وفارسی کی تعلیم کے لیے صرف سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہی بند نہیں کیے گئے بلکہ وہ بڑے بڑے اوقاف، جن پر مدارس کی زندگی کا دارومدار تھا، مختلف حیلوں بہانوں سے ضبط کرلیے گئے۔[۱۱] ان حالات میں اس بات کا امکان موجود تھا کہ یہاں کے مسلمانوں کا انجام سپین کے مسلمانوں جیسا ہو جہاں سلطنت وحکومت کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں کا بھی صفایا کردیا گیا تھا۔ اس اندیشے کا اظہار شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲ـ۱۷۰۳) نے اپنے زمانے میں ہی کردیا تھا جن کی وفات کے تین سال بعد بنگال پر قبضے سے انگریزوں نے اپنی فتوحات ہند کا آغاز کیا تھا۔[۱۲]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی برصغیر میں مدارس کی تاریخ کا ایک اہم موڑ (Turning point) تھا۔ پورا برصغیر اس استعماری طاقت کی غلامی میں چلا گیا تھا جس کے اولین حریف مسلمان تھے۔ ایسے میں کچھ پرعزم لوگ اٹھے۔ عوام الناس کی مدد سے انھوں نے اسباب ووسائل کی کم یابی کے باوجود اس خطے کی مسجدوں کو آباد اور نئی نسلوں کو قرآن وحدیث اور تعلیماتِ دین سے وابستہ رکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ بقول ایک مؤرخ ان کوششوں کی وجہ سے استعماریت کے اس "سیلابِ بلا میں جہاں سب کچھ بہہ گیا وہاں کم از کم تسبیح وسجادہ تو سلامت رہے اور سیاسی زوال کے ساتھ قوم کا دینی انحطاط نہ شروع ہوگیا"۔[۱۳]

قیامِ پاکستان کے بعد بھی مدارس سرکاری سرپرستی سے عام طور پر محروم ہی رہے لیکن اس کے باوجود یہ قافلہ سخت جاں نہ صرف اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے ہے بلکہ اپنے "متعین کردہ" اہداف ومقاصد کی طرف اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

۲۔ خواندگی اور خودانحصاری کی رفاہی تنظیم:

مدارسِ دینیہ کو پاکستان میں سب سے بڑی NGO بھی قرار دیاجاتا ہے۔ وہ ملک جس کی 60.19% آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کررہی ہو۔[۱۴] اور بچوں کی خوراک اور دواؤں کی ضرورت بھی پوری نہ کرسکتی ہو، وہاں بچیوں کی تعلیم کاسوچنا اور اہتمام کرنا دور کی بات ہے۔ ان دینی مدارس کا فیضان ہے کہ ہزاروں مستحق بچیاں یہاں اقامت پذیر ہوتی ہیں اور ان کے کھانے پینے، لباس اور رہائش کی فراہمی کی ذمہ داری مدارس اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بے روزگاری کی شرح 15-2014کے اکنامک سروے آف پاکستان کے مطابق 6% ہے۔[۱۵] ان مدارس میں اساتذہ، منتظمین اور ورکرز کی صورت میں سینکڑوں لوگ کسی نہ کسی درجے کے روزگار سے وابستہ ہوجاتے ہیں اور یوں بے روزگاری کی شرح کم کرنے میں بھی یہ مدارس مددگار ہیں۔

۳۔ دعوتی اور تربیتی ماحول کی تشکیل:

ان مدارس میں، خاص طور پر اقامتی ماحول میں زندگی کا کچھ حصہ گزارنے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ زندگی بھر اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ شعائر اسلامی کے احترام اور فرائض دینی کی پاسداری کے اہتمام کا احساس دیگر اداروں سے وابستہ بچوں کی نسبت مقابلتاً زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے عوام عام طور پر دینی علوم کے حاملین پر شرعی وفقہی مسائل میں اعتماد کرتے ہیں۔ مدارس سے فارغ التحصیل مرد حضرات مساجد ومدارس کا انتظام سنبھال لیتے ہیں اور خواتین عام طور پر اپنے گھروں میں دعوتی مراکز قائم کرتی ہیں یا کسی دینی مدرسے سے وابستہ ہوجاتی ہیں۔ وہ بچیاں، جو یہاں تعلیم حاصل کرتی ہیں، ان کے گھروں کی دیگر خواتین بھی ان مدارس سے تعلق رکھتی ہیں اور دروسِ قرآن اور مدرسے کی دیگر تقریبات میں شریک ہوتی رہتی ہیں یوں مدارس کا ایک معاشرتی دائرہ (social circle) تشکیل پاجاتا ہے۔

۴۔ عصری تعلیم کا اہتمام:

اکثر مدارس میں میٹرک، ایف اے، بی اے وغیرہ کی تعلیم کا انتظام بھی ہونے لگا ہے۔ طالبات عربی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ لازمی مضامین، انگریزی، مطالعہ پاکستان اور اردو وغیرہ کے ساتھ وہ

عربی اسلامیات کا امتحان دے لیتی ہیں اور اس سے ان کے قومی دھارے میں آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

دینی مدارس کا معاشرتی کردار توجہ طلب پہلو:

خواتین کے دینی مدارس کی ان ساری خدمات کے باوجود بہت سے پہلو ایسے ہیں جو فوری توجہ اور بنیادی اصلاحات کے متقاضی ہیں تاہم درج ذیل مطالعے (study) میں صرف معاشرتی مسائل اور ضروریات کے حوالے سے تحقیق کی کوشش کی گئی ہے۔

خواتین کی درسگاہوں سے اس خصوصی مطالعے کے لیے حاصل کی جانے والی معلومات (data) کے مطابق یہاں سے گزشتہ سالوں میں فارغ التحصیل طالبات کی تعداد لاکھوں میں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تعداد میں اکثریت ان طالبات کی ہے جو یہاں جزوقتی ناظرہ قرآن کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ باقاعدہ تعلیم ان کی سکولوں میں ہوتی ہے۔ پھر بھی مدارس کی اقامتی اور خالص دینی تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کی تعداد بھی سالانہ ہزاروں میں ہے۔[۱۶] مدارس کی فارغ التحصیل، علم دین کی حامل خواتین کی اس تعداد کو دیکھا جائے اور پاکستانی معاشرے کی دینی حالت کو۔۔۔ تو ان خواتین کا معاشرے میں متحرک اور جاندار کردار دکھائی نہیں دیتا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ:

- علومِ نبوت کی وارث یہ خواتین معاشرے میں قائدانہ کردار ادا کرتیں۔
- معاشرتی اعتبار سے، علم و فہم اور تدبر کے اعتبار سے ان کا مقام نمایاں ہوتا۔ ان کی فکر و دانش سے استفادے کی ضرورت محسوس کی جاتی اور انھیں نظرانداز کرنا ممکن نہ ہوتا۔
- فیصلہ سازی کے عمل میں ہر سطح پر ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔
- معاشرتی رجحانات کی تشکیل (trend setting) میں ان کا حصہ ہوتا۔
- گھریلو اور معاشرتی زندگی میں مدارس کی فارغ التحصیل طالبات کے کردار اور عمل سے متاثر ہو کر اور لوگ بھی دینی تعلیم کی طرف راغب ہوتے۔ اس کے نتیجے میں یا تو مدارس کی شرح داخلہ کئی گنا بڑھ جاتی یا عوام حکومت پر زور دیتے کہ عمومی تعلیمی نصابات میں دینی تعلیم کا حصہ بڑھایا جائے کیونکہ اس کے نتائج عام دنیاوی تعلیم سے کئی گنا بہتر ہیں۔

لیکن المیہ یہ ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک طرف دین کی غربت واجنبیت کے لیے حدیثِ نبوی ﷺ کی پیشن گوئی ہے۔ بدأ الاسلام غريبا وسيعود غريبا كما بدأ۔ [۱۷] دوسری طرف عالمگیریت globalization کے دور کے اپنے سے فتنے ہیں۔ سیکولر فکر کی پذیرائی، لادینی نظریات کی یلغار، میڈیا کے ذریعے دجّالی (دجل وفریب پر مبنی) پراپیگنڈہ، اسلامی شعائر، حتی کہ کتاب، رسول اور بنیادی عقائد تک نشانے پر ہیں۔ اسلامی معاشرے، ان کے نوجوان طبقات اور خواتین خاص طور پر اس تہذیبی یلغار کا ہدف ہیں۔ مشہور انگریزی کہاوت کے مطابق فوجوں کی یلغار توروکی جاسکتی ہے، افکار و نظریات کی یلغار کو نہیں روکا جاسکتا۔

(An invasion of armies can be resisted but an invasion of ideas cannot be resisted.)

ہماری معاشرت، اقدار، ثقافت، روایات، باہمی تعلقات اور حقوق وفرائض کے سارے تصورات، حقیقی دینی تعلیمات سے دن بدن دور ہوتے جارہے ہیں۔ یہ وقت کے معاشرتی چیلنج ہیں۔ دوسری طرف دیکھاجائے تو 90% مدارس نے اس قسم کے مقاصد کو پیشِ نظر رکھا ہی نہیں ہے۔ (14مدارس سے بروشر لیے گئے تھے) کسی ایک مدرسے نے بھی اپنے فکری و عملی مقاصد (vision or mission) میں یہ نہیں لکھا کہ آج کے تہذیبی چیلنج کے مقابلے کے لیے نئی نسلوں کی تیاری ان کا مطمع نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو فصل (product) ان مدارس سے برآمد ہورہی ہے، اپنے ارد گرد کی دنیا سے نہ صرف آگاہ نہیں ہے بلکہ ایک درجہ بے گانہ وبے نیاز ہے۔

ہماری معاشرتی ضروریات اور تقاضے، دینی مدارس کے مطلوب کردار، اور موجودہ عملی صورتِ حال کو جانچنے کے لیے زیرِ نظر تحقیق study چند براہ راست جائزوں کی مدد سے لی گئی۔

- مدارس کی فارغ التحصیل10 طالبات سے ان کی آراء لی گئیں۔ (انٹرویو اور بالمشافہ تفصیلی گفتگو کے ذریعے سے۔)
- ہر مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مدارس کی مہتممات اور اساتذہ سے سروے کروایاگیا (تقریباً 25خواتین) تاکہ معلوم ہوسکے کہ کیا ان کی ترجیحات میں یہ بات موجود ہے کہ ان کی فارغ التحصیل طالبات معاشرے میں دین کی اجنبیت دور کرنے اور دینی اقدار کے فروغ کا باعث بنیں۔ اور کیا اساتذہ میں طالبات کے اندر قائدانہ کردار ادا کرنے کی سپرٹ (spirit) پیدا کرنے پر توجہ ہے؟

- انھیں نکات کے تحت بعض مدارس میں خود جاکر، اور ان کی اہم اساتذہ سے ملاقاتیں کرکے اور ان کی سالانہ تقریبات میں شرکت کرکے براہ راست مشاہدات اور گفتگو سے نتائج اخذ کیے گئے۔ واضح رہے کہ ان خواتین کو مطلع نہیں کیا گیا کہ آنے کا مقصد کیا ہے؟
- ان خواتین سے آراء لی گئیں جو مدارس کی فارغ التحصیل خواتین کے قائم کردہ حلقہ ہائے درس میں شرکت کرتی ہیں۔ (100خواتین سے سروے)یوں qualitative & quantitative research methodology استعمال کرتے ہوئے مندرجہ بالا چاروں ذرائع سے جو مسائل سامنے آئے، اور جن کے بارے میں محسوس ہوا کہ عصرِ حاضر کے مطلوب کردار کو پیدا کرنے میں بڑی رکاوٹ ہیں، ان میں سے بعض اہم نکات درج ذیل ہیں۔

مسلک ومذہب کی مرکزیت:

خواتین کے مدارس کی عالمات تیار کرنے کی کلاسوں کے لیے ہاسٹل میں قیام لازمی شرط ہے۔ (جیساکہ بروشرز سے ظاہر ہوا۔) یہ بات ذہن میں رہے کہ ہمارے 90% مدارس مسلکی بنیادوں پر قائم شدہ ہیں۔ (پانچ میں سے چار مسلکی وفاقوں سے وابستہ) طالبات وہیں پڑھتی اور مقیم رہتی ہیں۔ جو فقہی آراء انھیں پڑھائی جاتی ہیں، اپنے اس محدود ماحول میں وہ انھیں پر سو فیصد عمل ہوتا دیکھتی ہیں۔ دو یا چار سال مدرسے میں قیام کے عرصے میں وہ اس ماحول کی اتنی عادی ہو جاتی ہیں کہ عام طور پر کسی دوسرے نقطہء نظر یا طریقہء عمل کو قابل اعتنا بھی نہیں سمجھ سکتیں۔ جبکہ معاشرے میں، جہاں باہر نکل کر انھیں پبلک کو مخاطب کرنا ہے، وہاں سب مسالک کے لوگ ملے جلے رہتے ہیں۔ جمہور علمائے امت کی رائے کو بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ کے عامۃ الناس کے لیے چاروں فقہی مسالک میں سے کسی ایک کی پیروی اختیار کرنے کو عین صواب قرار دیا ہے[۱۸] اور پاکستانی معاشرے کا عمومی طرز عمل بھی یہی ہے۔

ہمارے مدارس کا بہت بڑا المیہ ہے کہ یوں تو وحدتِ امت کے پر چار سے زبانیں نہیں تھکتیں، لیکن مسلکی تعصّبات کا معاملات پر اثر بڑا واضح اور نمایاں ہے۔ کل پانچ اور صرف اہل سنت کے چار وفاق خود اس تفریق کی گواہی دیتے ہیں۔ خود اہل مدرسہ اس معاملے کو چھپانے کی بھی بہت کوشش نہیں کرتے۔ مثلاً مسلکی معاملات پر اظہار خیال کرنے کے حوالے سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں ایک سینئر استاذہ نے لکھا کہ "مسلکی غیرت بعض اوقات " اظہارِ حق " کا تقاضا کرتی ہے۔ " ایک مدرسے کی انتظامیہ نے سروے میں اپنی طالبات کی معاشرتی خدمات کے بارے میں سوال پر ایک ہی نکتہ بیان کیا۔ " ہماری طالبات نے فلاں فلاں شہر میں ۔۔۔ (مسلک کا نام لکھا تھا) کے خلاف جہاد کیا۔ " مدارس کی طالبات سے جو

آراء لی گئیں ان کے مطابق مدرّسات ناظرہ پڑھنے کے لیے آنے والی جز وقتی طالبات پر بھی مسلکی حوالوں سے طنز سے باز نہیں رہتیں۔ فارغ التحصیل طالبات اپنے قیام مدرسہ کے عرصے میں اس طرزِ عمل کی اتنی عادی ہو جاتی ہیں کہ بعد ازاں ان حوالوں سے کسی تلخ تبصرے سے اپنے آپ کو روک نہیں پاتیں۔

دوسری طرف ہمارا معاشرہ عام طور پر اس طرزِ عمل سے بے زار ہے۔ جب مدرّسات کی طرف سے عمومی اجتماعات، دروسِ قرآن اور قرآن وحدیث کی کلاسوں میں کسی فقہی نقطہء نظر کو "واحد قابل قبول" رائے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تو لوگوں کی اکثریت بے چینی اور لاتعلّقی کا اظہار کرتی ہے۔ دوسرے نقطہء نظر کی حامل خواتین ایسے حلقہء درس کو چھوڑ دیتی ہیں یا دفاعی (defensive) پوزیشن اختیار کرتے ہوئے "اپنے مسلک" کا حلقہء درس تلاش کرنے لگتی ہیں۔ یوں ہمارا پہلے سے تقسیم شدہ معاشرہ (split society) مزید تقسیم کی طرف آگے بڑھنے لگتا ہے۔

یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ عام لوگوں کی اکثریت نماز کی پابند نہیں ہے۔ انھیں وضو اور غسل کے فرائض تک کی واقفیت نہیں ہے۔ طالبات کے کالجوں میں روزہ رکھنے والی طالبات کم نظر آتی ہیں۔ زکوۃ کے بارے میں یونیورسٹی کی 40 طالبات کی ایک کلاس میں پوچھا گیا اور بچیاں گھروں سے پتہ کرکے آئیں۔ معلوم ہوا پانچ سات گھرانوں کو نصاب کا علم تھا اور حساب کرکے زکوۃ نکالنے کا۔ باقی لوگوں کو شرح زکوۃ تک معلوم نہیں تھی۔ اب یہ عجیب نہیں کہ ان کی اساتذہ محلے کے درسِ قرآن یا قرآن کلاس میں انھیں رفع الیدین کی فضیلت اور عدم فضیلت یا وتر پڑھنے کے طریقوں میں سے افضل اور مفضول سکھانے پر مصر ہیں حالانکہ یہ معاملات ہر دو طرح سے نبی کریم ﷺ کی سنتِ ثابتہ ہیں۔

مطالعہ کی محدودیت:

جدید طرز تدریس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ کسی بھی مضمون کے نصاب پر مقررہ کتب کے علاوہ مجوزہ کتب (recommended books) کی ایک فہرست طلبہ واساتذہ کو مہیا کی جاتی ہے جو اس موضوع کی مختلف جہات سے آشنا کرواتی ہیں۔

ہمارے مدارسِ دینیہ میں مقررہ نصاب پر تو بہت زور ہے، تفصیلی اور ہمہ جہت مطالعے کی طرف توجہ نہیں ہے۔ مدارس کی انتظامیہ اور اساتذہ سے سروے میں سوال کیا گیا کہ تدریس کے لیے علوم وفنون کی ایک ہی کتاب مقرر کی جاتی ہے یا طالبات سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ دیگر کتب کا مطالعہ بھی کریں۔ 90% رائے یہ سامنے آئی کہ صرف ایک کتاب مقرر کی گئی ہے۔ اس سے زیادہ کتابیں پڑھنے کی نہ ضرورت ہے، نہ وقت میسر ہے۔ ایک صدر مدرسہ نے لکھا "جب طالبات مدرسے سے فارغ ہوں گی تو وہ

خود اور کتابیں دیکھ سکتی ہیں۔ مدرسے میں تعلیم کے دوران اس کی اجازت نہیں ہے۔ "ایک اور مدرّسہ نے لکھا "ہم طالبات سے کہتے ہیں کہ پہلے کتاب ہمیں دکھائیں۔ اگر وہ اس "قابل" ہو کہ طالبات اسے پڑھ سکتی ہیں تو انھیں اجازت دیتے ہیں ورنہ نہیں۔"

دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ عام طور پر مدارس میں بڑی لائبریریاں موجود نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو بھی تو اپنے محدود اور مسلکی نقطہ ٔ نظر کے علاوہ کوئی کتاب وہاں نہیں رکھی جاتی۔ یہ معاملہ مدارس میں انفرادی سطح پر نہیں، وفاق اور بورڈ کی سطح پر ایک طے شدہ پالیسی کے تحت باقاعدہ متعین ہے۔ سلیم منصور خالد لکھتے ہیں:

"دینی مدارس کے نصاب میں بظاہر کوئی فرقہ وارانہ چیز دکھائی نہیں دیتی۔ اکثر کتب علم وفن پر مبنی ہیں۔ البتہ چاروں مسالک کے مختلف مدرسوں کی انتظامیہ کے ذوق اور ترجیحات کے تابع ہدف متعین ہوتا ہے۔ بعض مدارس تو اس حوالے سے اپنے تخصص میں شہرت بھی رکھتے ہیں مثلاً وفاق المدارس العربیہ پاکستان (دیوبندی) نے 1983 میں جو نصاب منظور کیا اس کے مطابق درجہ عالمیہ سال اول کے لیے اسی نوعیت کی کتب کے نام متعین طور پر دیے گئے۔ کتب کی تعداد اس طرح ہے: ردّ رفض۔ 09 کتب، ردّ بدعات (بریلوی)، 19 کتب،

ردّ جماعت اسلامی۔ 03 کتب، ردّ اہلحدیث۔ 10 کتب، اسی طرح دیگر مسالک بھی حسب ضرورت غیر اعلان شدہ کتب پڑھاتے ہیں۔ یہ کتب درسِ نظامی کی امتحانی ضرورت کے لیے نہیں ہوتیں البتہ ذہن سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔"[۱۹]

مسلکی مطالعات کی اس طویل فہرست نے وقت کے تقاضوں اور چیلنج سے اہل مدرسہ کی نظر ہٹا دی ہے۔ سائنسی علوم کی مبادیات تو معلوم ہونا چاہئیں، جو آج کے الحادی فکر کی اصل بنیاد ہیں، لیکن مدارس کے لوگ اس کے قائل نہیں ہوتے نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ یہ میدان ہی دوسرا ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اہل مدرسہ کو علومِ معاشرت کی طرف بھی متوجہ کیا تھا جو مدرسے کا حقیقی میدانِ کار ہے:

"اہل علم اور علماء کرام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مغربی علوم وفنون کا تنقیدی انداز میں مطالعہ کریں۔ ان کے پانچ علوم ایسے ہیں جو اس وقت سب سے زیادہ غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں۔ جتنا کفر والحاد اس دور میں پھیلا ہے، وہ انھیں پانچ علوم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ (۱) علم نفسیات، (۲) علم بشریات،

(۳) علم عمرانیات، (۴) علم سیاسیات، (۵) علم معاشیات۔ علماء کرام کو ان علوم کا مطالعہ کرکے ان میں موجود غلط اساسات و تصورات کی تردید عقلی انداز میں دلائل و شواہد کے ساتھ کرنی چاہیے۔"[۲۰]

وہ صاحبانِ علمِ دین، جنھوں نے دینی علوم میں درک اور عالمی پہچان حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دنیا دیکھ رکھی ہے، اہل مدرسہ کی توجہ اہم مسائل کی طرف کرواتے ہیں لیکن یہاں "مناظرہ" اور "ذہن سازی" اور "دلائل کا توڑ" وقت کے چیلنجز سے مقابلے کے لیے نہیں (جیسا کہ غزالیؒ اور رازیؒ نے اپنے وقت میں کیا) مسلکی برتری کے لیے ہے۔ جن موضوعات پر ڈاکٹر غازی صاحب نے توجہ دلائی، معاشرت کے بنیادی سوالات آج وہیں سے اٹھ رہے ہیں۔ مطالعے کی محدودیت کی وجہ سے مدارس کی فارغ التحصیل خواتین، جدید تعلیم یافتہ خواتین کے نہ تو سوال سمجھ پاتی ہیں، نہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہوتی ہیں۔

تفقّہ اور استدلال کی تربیت:

اسلام کی تعلیمات انتہائی معقولیت پر مبنی ہیں۔ علماء نے ایک عمومی قاعدہ مقرر کیا ہے کہ نقلِ صحیح، عقلِ صریح کی مخالفت نہیں کرتی۔ قرآن مجید نے بھی دلائل کے لیے استقراء کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ ہر ایک کو نظر آنے والی عمومی اشیاء کی مثالوں سے مجرد عقائد اور مابعد الطبعیات پر استدلال کیا گیا ہے مثلاً زمین، آسمان، بادل، بارش اور ہوائیں، اور ان عام مشاہدات پر غور فکر سے توحید اور آخرت کا اثبات۔ شاہ ولی اللہ کے مطابق اس طریقے سے قرآن مجید انسانیت کے ہر طبقے اور ہر دور کے لیے آسان اور قابلِ فہم ہوگیا۔[۲۱] (وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ)[۲۲]

ہمارے عمومی تعلیمی نظام میں بچوں کو ضروری دینی معلومات مہیا کرنے کا مناسب اور مؤثر انتظام موجود نہیں ہے۔ دوسری طرف انھیں بچوں پر پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کی یلغار ہے۔ انھیں عالمی سطح پر جاری فکری اور عام طور پر اسلام مخالف مباحث تک رسائی حاصل ہے۔ اس پر مستزاد مادیت پرستی اور افادیت پرستی (Materialism & Utilitarianism) کے رجحانات، جو غبار کی طرح ہر شخص کو متاثر کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں نئی نسل کو واجباتِ دین کی ادائیگی پر قائل کرنے کے لیے بھی غیر معمولی ذہنی مشق درکار ہے۔ قرآن مجید میں یہ انداز اختیار کرکے احکامِ دینیہ کی کئی جگہ حکمتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ مثلاً نماز کی حکمت یوں بتائی: إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ[۲۳] تقسیم دولت کی حکمت یہ بیان فرمائی: كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ[۲۴] حج کے بارے میں فرمایا: لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ[۲۵]

مدارس کے نظام تعلیم میں "نقل" اور دلائلِ نقلیہ" پر زور ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل خواتین عوام الناس میں دلائل نقلیہ کے ساتھ آتی ہیں۔ قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ کو دورِ حاضر پر منطبق کرنے، عام لوگوں کے ذہن میں اتارنے اور جدید جاہلیت کو جدید طریقے سے رد کرنے کے حوالے سے عام طور پر کافی معلومات نہیں رکھتیں۔ نتیجۃً عوام الناس اور خاص طور پر تعلیم یافتہ نوجوان نسل ان تبلیغی اور اصلاحی سرگرمیوں سے دور رہتی ہے جہاں محض "جبر" کی تعلیمات ہیں۔ انسانی ضروریات ،اس کی نفسیات ،اس کے زمانے اور دنیاوی حکمتوں سے جس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

توسّع اور یسر کی ضرورت:

فتویٰ بڑا نازک میدان ہے۔ ایک عام آدمی بھی اس کا احساس رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے لوگ بڑے معاملات (نکاح وطلاق ووراثت وغیرہ) میں شہر کے بڑے علمی مراکز سے رجوع کرتے ہیں۔ دینی تعلیم یافتہ خواتین سے دروسِ قرآن اور فہم قرآن کلاسوں میں خواتین بڑے مسائل نہیں، عمومی معاملات کے بارے میں استفسارات کرتی ہیں۔ زیادہ تر یہ سوالات نماز، روزہ، زکوٰۃ، معاشرتی معاملات مثلاً لباس، تقریبات وغیرہ، اسی طرح پردہ، مشترکہ خاندانی نظام، تعدّدِ ازدواج اور آرائش وزیبائش وغیرہ کے بارے میں ہوتے ہیں۔

شریعت اسلامی کا عمومی معاملہ یہ ہے کہ عقائد وعبادات میں تو کسی اضافے کی گنجائش نہیں دی گئی لیکن معاملاتِ زندگی کے میدان کو وسیع رکھا گیا ہے۔ حکمتِ تشریع کے اہم اصولوں میں عدمِ حرج ، قلّتِ تکلیف، تدریج اور یسر قابل ذکر ہیں۔ عرف وعادت اگر مقاصدِ شریعت سے نہیں ٹکراتی اور باہمی تعاون کے مقصد کو پورا کرتی ہے تو اس کی رعایت کی گئی ہے۔ اسی طرح احکام کے درجات ہیں۔ فرض، واجب، مستحب، مباح اور مکروہ۔ یوں ایک عام معاشرتی معاملے میں کسی استفسار کا جواب دینے کے لیے بہت سے امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔[۲۶] شاہ ولی اللہ اسے "حکمتِ عملی" یعنی معاملات کی سوجھ بوجھ اور فہم سے تعبیر کرتے ہیں۔[۲۷]

اس سلسلے کے بعض مشاہدات بڑے تلخ تھے۔ استئذان کے احکام بتاتے ہوئے، ایک مشہور مدرسے کی فارغ التحصیل معلّمہ نے اسلام کے اس سیدھے سادے حکم کو ایسا "ہفت خواں" بنا کر پیش کیا کہ ساری مجلس مبہوت تھی کہ اس حکم پر بھلا عمل کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قرآنی کلاس کے اختتام پر جب سوالات شروع ہوئے تو بعض مباح امور کو مدرّسہ نے بلا تکلف حرام قرار دے دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کوئی معاملہ آتا تو آپ اس کے آسان پہلو کو ترجیح دیا کرتے تھے۔[۲۸] عصرِ حاضر کے مشہور فقیہ علامہ یوسف القرضاوی اپنی مشہور کتاب "فی فقہ الاولویات" (جس کا ترجمہ "دین میں ترجیحات" کے نام سے کیا گیا ہے۔) میں لکھتے ہیں کہ مفتی کو کسی معاملے میں "احوط" یعنی زیادہ مبنی بر احتیاط لیکن مشکل معاملے کی بجائے "ایسر" یعنی زیادہ سہولت والے معاملے پر فتویٰ دینا چاہیے۔[۲۹] معاشرتی میدان میں اہلِ دین کے سخت فتاوٰی نے یہ ماحول پیدا کر رکھا ہے کہ لوگ استفسار کی جرات ہی نہیں کرتے کہ "مولوی" سب کچھ منع کر دیں گے۔ یوں ایک عالم کے الفاظ میں گناہ جانتے ہوئے ایک کام کرتے رہنے سے یہ صفت نفسیات کا حصہ بننے لگتی ہے اور دیگر گناہ بھی آسان ہو جاتے ہیں۔[۳۰]

فنون اور ہنر مندی کی تعلیم:

اسلامی تاریخ میں مدارس کی یہ روایت رہی کہ علوم دینیہ کے ساتھ فن اور ہنر کی تعلیم بھی دی جاتی تھی تاکہ طلبہ عملی زندگی میں آزادانہ معاش کا انتظام کر سکیں۔ طب، کتابت، جلد سازی، گھڑی سازی وغیرہ کی تعلیم ہندوستان کے مدارس میں بھی عام تھی۔ معاش کی آزادی اور فراخی، عامۃ الناس سے مالی معاملات میں ایک درجہ استغناء اور بے نیازی ایک صاحب علم کو وقار اور جرات عطا کرتی ہے۔

طالبات کے مدارس میں اس حوالے سے اچھی خاصی غفلت نظر آتی ہے۔ ایک صدر معلّمہ نے بتایا کہ انھوں نے عام گھر داری کے، (ہنر مندی نہیں) مثلاً کچھ کھانے بنانا اور ابتدائی سلائی کے کچھ اسباق ٹائم ٹیبل میں رکھے ہیں لیکن "جان پر کھیل کر" کیونکہ "وقت ہی نہیں ہوتا ان کاموں کے لیے۔" سوال یہ ہے کہ میٹرک کے بعد ایک طالبہ اگر چار سال کے لیے اقامتی مدرسے میں آئے، اس کی سالانہ چھٹیاں بھی مختصر ہوں، اور یہاں وہ بنیادی گھر داری بھی بمشکل سیکھ پائے، تو اپنی مستقبل کی گھریلو زندگی، یا اگر معاشی ضروریات آن پڑیں، تو ان تقاضوں کو کس طرح نبھا سکے گی؟ مدارس کی اساتذہ سے جو سروے کیا گیا، اس میں پوچھا گیا کہ طالبات معاشی ضرورت اگر پیش آ جائے تو کیا کرتی ہیں۔ 95% جواب آیا کہ مدارس بناتی ہیں، یا مدرسے سے تدریس سے وابستہ ہو جاتی ہیں، یا پھر رضاکارانہ تدریس کرتی ہیں۔

یہ ہزاروں طالبات مدارس میں ہی نہیں کھپ جاتیں۔ مدارس کی 80% یا 90% طالبات اگر کم آمدنی کے طبقے سے آتی ہیں، اپنا خرچ بھی برداشت نہیں کر پاتیں تو ظاہر ہے لوٹ کر بھی وہیں جاتی ہیں۔ کم آمدنی والے طبقات میں اگر یہ خواتین صرف درسِ قرآن وحدیث کے ساتھ ہنر سکھانے والی بھی ہوں تو اپنے گرد و پیش کے لیے زیادہ بابرکت ثابت ہوں گی۔ افریقی ممالک، جہاں مسیحیت نے تیزی سے قدم

بڑھائے، اور جو مغربی یونیورسٹیوں میں تحقیق کا مستقل موضوع ہے، وہاں مشنری کام کرنے والوں نے اس کا اہتمام کیا۔[۳۱] ایک تبیشری پادری سے ملاقات کرنے والا اس کو ڈھونڈتا ہوا پہنچا تو وہ گاڑی کے نیچے گھسا اپنے شاگرد کو کام سکھارہا تھا۔ طریقِ کار یہ تھا کہ وہ بچوں کو مکینک کا کام سکھاتا، تبلیغ کرتا اور عیسائی بناتا۔ اس کے بعد ورکشاپ کھولنے کے پیسے دے کر اگلے گاؤں کا رخ کرتا۔

ہمارے مدارس میں زیر تعلیم طالبات کتنے ہی ہنر سیکھ کر، اپنے گھروں کو ان کا مرکز بناسکتی ہیں۔ کم پیسوں میں، مشنری جذبے کے ساتھ سکھائیں تو عام آبادی کا ان کی طرف رجوع بڑھے گا۔ لوگ دین بھی سیکھیں گے اور دنیاوی فائدے بھی پائیں گے۔ یہی میدان دین بے زار این جی اوز نے سنبھال رکھے ہیں۔ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الأَرْضِ[۳۲] مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے آج سے عشروں پہلے خواتین کے لیے جو کتاب "بہشتی زیور" لکھی، اس میں گھریلو ہی نہیں، تجارتی پیمانے پر بھی بعض اشیائے ضرورت بنانے کے طریقے سکھائے۔ حساب کتاب لکھنے کے اسباق شامل کیے اور گھرداری، سلیقے اور اہل خانہ کا خیال رکھنے کے حوالے سے پوری تربیت کا اہتمام کیا۔

احوالِ عالم سے بے اعتنائی:

دنیا آج عالمی گاؤں global village کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ ایک تو خبر سرعت سے پھیلتی ہے کہ میڈیا طاقتور اور تیز رفتار ہے، دوسرے دنیا کے کسی گوشے میں پیش آنے والا مسئلہ یا واقعہ پوری دنیا کو فکری اور عملی طور پر متاثر کرتا ہے۔ معاملہ یہ بھی ہے کہ میڈیا کی یہ طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، اس لیے عام طور پر ایسے اثرات مسلمانوں کے حق میں نہیں ہوتے۔

ادھر ہمارے مدارسِ دینیہ کی عمومی صورتِ حال یہ ہے کہ اخبار پڑھنا وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔ خبروں کے دیگر ذرائع مثلاً ٹی وی اور انٹرنیٹ وغیرہ تک عام طور پر طالبات کو رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ مدرسے کی محدود چار دیواری کے اندر دیکھا جائے تو بچیاں گو مطمئن نظر آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے حالات سے بے خبر ہوتی ہیں۔ خواتین اساتذہ بھی عام طور پر مدرسے میں قیام پذیر ہوتی ہیں، اور اسی ماحول کا حصہ، چنانچہ ان کا حال بھی وہی ہے۔ احوال عالم سے دلچسپی پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ تاریخ اور جغرافیہ ہوسکتا ہے لیکن یہ ہمارے مدارسِ دینیہ کے نصاب کا حصہ نہیں ہے۔ کہیں اگر تاریخ اسلام شامل نصاب ہے بھی تو عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ سے آگے نہیں جاتی، جبکہ آج کے مسائل وہ ہیں جو ہماری تاریخ سے بھی جڑے ہیں اور جغرافیے سے بھی۔ برصغیر کی تاریخ معلوم نہ ہو تو کشمیر اور برما کے مسائل سمجھے نہیں جاسکتے۔ یہودیت کی تاریخ معلوم نہ ہو تو فلسطین کا مسئلہ کیسے سمجھا جاسکتا

ہے۔ کروسیڈز کی تاریخ معلوم نہیں تو کسی کو کیا پتہ کہ عراق جنگ میں اتحادی افواج کے سرخیل، امریکی صدر کی زبان سے یہ لفظ کیوں پھسلا۔ قیام پاکستان کے مقاصد، تاریخ اور پس منظر کا پتہ نہ ہو تو موجودہ حالات کا گلہ بنتا ہی نہیں۔ مشرقی تیموراور جنوبی سوڈان کے الگ ہونے میں تبشیری سرگرمیوں کا بھی کردار تھا، اگرچہ عالمی طاقتوں کی سرپرستی میں یہ مسلم ممالک دولخت ہوئے۔ دینی تعلیم کے وہ ادارے، تبلیغی سرگرمیاں جن کے اہداف ومقاصد میں سرفہرست ہیں، اپنے طلبہ وطالبات کی ان احوالِ عالم سے بے خبری کا کیا جواز پیش کر سکتے ہیں؟ یونیورسٹی میں ایم فل کے داخلے کے لیے آنے والی ایک طالبہ سے جو ایک مشہور دینی مدرسے سے "عالمہ" کی تازہ سند لائی تھیں اور ایم اے کا جزوی امتحان بھی پاس کر چکی تھیں، پوچھا گیا کہ "شام" میں کیا ہو رہا ہے؟ شام وہ مسئلہ ہے جس پر دنیا چیخ پڑی ہے، لیکن طالبہ کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ آسان سوال پوچھا کہ اس دفعہ منیٰ میں کیا حادثہ ہوا ہے۔ وہ اس سے بھی بے خبر تھیں۔

احوال عالم سے یہ بے خبری اچھی خاصی بے حسی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ڈھونڈیں تو بلاشبہ وہ نصاب میں بھی ملتی ہے۔ یونیورسٹیوں کے ایم اے اسلامیات کے نصاب سے رہنمائی لی جاسکتی ہے جہاں عالمِ اسلام کے وسائل ومسائل کے نام سے ایک مضمون موجود ہے۔ "تاریخ اسلام" مکمل نصاب کا حصہ ہے۔ اسی طرح جدید فکری چیلنج، نصاب کا اہم حصہ ہونے چاہیئں۔ خواتین کے مدارس میں حقوقِ نسواں کے مغربی تصورات کا تقابلی مطالعہ کروایا جاسکتا ہے۔ مغربی لادینی تصور پر مبنی حقوق نسواں کی تنظیموں کے یہ ایجنڈے آج اقوام متحدہ کے اگلے ہزاریے کے اہداف میں شامل ہیں۔ سارے مسلم ممالک کے ساتھ پاکستان بھی ان پر عمل درآمد کا پابند ہے۔ [۳۳] اس کنونشن پر دستخط کرنے کے بعد سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی طالبات کو مدارس کے "جزیروں" تک محدود رکھ کر کوئی بڑے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے۔ جس دنیا میں انھیں نکلنا اور کام کرنا ہے، اس کی درست معلومات بروقت ان تک پہنچانے کا اہتمام ضروری ہے۔

تدریسی طریقہ کار میں بہتری کی ضرورت:

کوئی شعبہ، علم بجائے خود کتنا ہی اہم اور نافع کیوں نہ ہو، مؤثر تدریس کے بغیر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ صدیوں کے تدریسی تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے اس حوالے سے آج جو تحقیقات ونظریات پیش کیے جارہے ہیں، اور جن کی روشنی میں تعلیمی وتدریسی عمل میں انقلابی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں، ان میں سے اکثر کی افادیت مسلّم ہے۔ وہ مدرس، جو تھوڑا سا بھی ذوق وشوق رکھتا ہو،

ان مہارتوں کو سیکھنا اور استعمال کرنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے، البتہ اس معاملے کی اہمیت تسلیم کرنا ضروری ہے۔

خواتین کے مدارس کی انتظامیہ اور اساتذہ سے جو معلومات حاصل کی گئیں ان کے مطابق تدریسی معاونت کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ عام طور پر بیانیہ تدریس ہے۔ (۸۵ فیصد تک) صرف پندرہ فیصد نے بتایا کہ وہ کلاس میں بورڈ اور مارکر استعمال کرتے ہیں۔ صرف دس فیصد نے آڈیو ویڈیو معاونات کی بات بھی کی۔ رجسٹرڈ مدارس کو جب سے کمپیوٹر ملنے لگے ہیں، ان کا تھوڑا بہت رجحان اس طرف ہوا ہے لیکن طلبہ کے مدارس کی نسبت طالبات کے ہاں ابھی بھی اس حوالے سے بہت توجہ نہیں ہے۔ کہیں کہیں کلاس میں بحث ومباحثہ کی اجازت دی جاتی ہے لیکن "حدوں کے اندر۔" قابل توجہ بات یہ ہے کہ ۷۵ فیصد اساتذہ اپنی تدریس سے مطمئن تھیں۔ صرف ۲۵ فیصد نے اظہار کیا کہ وہ کسی تدریسی ورکشاپ یا اساتذہ کی تربیت کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔

درحقیقت دینی مدارس میں اساتذہ کے اس رویے کو ایک اور جہت سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ سرکار کے ہاں تو پرائمری سکولوں میں بھی استاد کی تقرری کے وقت کسی پیشہ ورانہ ڈگری کی ضرورت ہے، لیکن دینی مدارس میں اساتذہ یا تو مدرسے کے منتظمین کے خاندان کی ارکان ہوتی ہیں۔ (بہنیں، بیویاں، بیٹیاں وغیرہ) یا ان کے قریبی تعلق کے واسطے سے تدریسی ذمہ داریاں سنبھالیتی ہیں۔ ایسی اساتذہ کی تقرری میں اہلیت اور میرٹ کا کوئی تصور عام طور پر موجود نہیں ہے۔ تدریس کا بنیادی تصور بھی بس اتنا ہے کہ کتاب کا متن پڑھانا اور "سبق" یاد کروانا ہے۔ "اتنی سی تدریس" کے لیے اہل مدرسہ بہت توجہ اور اہتمام (bother) بھی نہیں کرتے۔ چونکہ استاد بننے کے لیے کوئی مقابلہ نہیں ہے، اس لیے اساتذہ کو بھی نہ مدرسہ بننے سے قبل، نہ دوران تدریس کسی تربیت یا اپنے کام کو بہتر بنانے کا خیال آتا ہے نہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اس ساری صورت حال میں یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ کسی بھی فن کی تحقیق، تفہیم، تجزیہ اور اطلاق، اخذ نتائج اور گزشتہ تعلیمی تجربے کی روشنی میں آئندہ اس عمل کو بہتر بنانے کی کوششیں اگر "جدید تعلیمی عمل" کا حصہ ہیں تو ان کے قبول کرنے میں کون سی قباحت ہے؟ دینی تعلیم میں سب کچھ وہ شامل ہے جس کا عملی زندگی میں اطلاق ہوتا ہے۔ اگر طالبات کو اس حوالے سے عملی سرگرمیوں میں مشغول کیا جائے، معاشرتی رجحانات کا ان سے تجزیہ کروایا جائے اور بدلتی صورت حال میں اصولِ دین کو قائم کرنے کے حوالے سے رہنمائی دی جائے تو وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد معاشرے کے لیے زیادہ

مفید ثابت ہوں گی بہ نسبت ان طالبات کے، جو صرف ونحو میں تو بڑی ماہر ہوں، لیکن عملی معاملات کی سوجھ بوجھ میں بہت پیچھے۔ عامۃ الناس کو دین کا پیغام اس کی اصل روح کے ساتھ پہنچانا انھیں "عالمات" کے لیے ممکن ہے جنھیں روح دین سکھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ صرف "علوم آلیہ" کی واقفیت معاشرے کی ضرورت کو پورا نہیں کرتی، خاص طور پر حلقہء نسواں میں۔ [۳۴] سروے کے نتائج کے مطابق فہم قرآن مجید کی کلاسوں کی مستقل شرکاء میں سے صرف آٹھ فیصد خواتین عربی گرامر سیکھنا چاہتی تھیں، باقی بانوے فیصد (92%)اس بات کو کافی سمجھتی ہیں کہ انھیں قرآن وحدیث کا پیغام سمجھ آجائے۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس جدید تعلیمی اسلوب کی ساری مفید "مہارتیں" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہء تعلیمی میں جابجا ملتی ہیں۔ اگر اہل مدرسہ جدید ماہرین تدریس کے سامنے نہیں تو مدرسہء نبوت کے سامنے ہی زانوے تلمذ تہ کرلیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریس کو مشن سمجھا اور اس راہ میں اپنی ساری توانائیاں صرف کیں۔ عام فہم مثالیں دے کر دین سے بالکل ناآشنا عربوں کوعلومِ دین ودنیامیں امام بنایا۔ پانچ نمازوں سے گناہ دور ہونے کی مثال پانچ بار ندی میں نہانے سے دی، [۳۵] ایک ہاتھ کی دوانگلیوں کو جوڑ کر جنت میں اپنی معیت کی خوشخبری کی "محسوس" مثال دی۔ [۳۶] زمین پر ایک مربع بناکر اور کچھ خط مربع سے باہر کھینچ کر سمجھایا کہ یہ زندگی ہے انسان کی، اور یہ باہر نکلتے خط اس کی امیدیں ہیں جو حد زندگی سے باہر نکل پڑتی ہیں۔ [۳۷] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طلبہ کے سامنے اپنامثالی کردار پیش فرمایا، رسوخ فی العلم کی اہمیت کو اجاگر کیا، ان سے پر خلوص محبت کے ذریعے انھیں اس راستے کا راہی بنایا جو انبیاء کرام علیہم السلام کا مشن تھا۔ انھیں بلند مقاصد اور بڑے اہداف دیے اور حکمت کے ساتھ ان کے حصول کی کوشش کرنا سکھایا۔ "فیضانِ نظر اور مکتب کی کرامت" دونوں کو جمع کیا اور دینی ودنیاوی اعتبار سے وہ بہترین نتائج پیدا کیے جن کا اعتراف دشمنوں نے بھی کیا۔

نصیبِ مدرسہ یارب یہ آبِ آتش ناک!

عملی اقدامات کی ضرورت:

مدارس کے کردار کی بہتری کے حوالے سے تحقیق، مطالعات، مشاہدات اور تجاویز کی کمی نہیں ہے۔ حکومتی بھی، اور ہمدردان مدرسہ کی سطح پر بھی اس حوالے سے اہل مدرسہ کے ساتھ تعاون کے لیے لوگ تیار ہیں۔ اہل علم انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں۔ [۳۸] اس حوالے سے تو ان کی معاشرتی ذمہ داریاں بڑی وسیع ہیں ہی، لیکن پاکستان کے تناظر میں اس لیے بھی یہ معاملہ اہم ہے کہ مدرسے کی مالی ضروریات مکمل طور پر ہمارا معاشرہ ہی پوری کرتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا" اس دین کا پیغام ہر کچے اور پکے گھر میں پہنچے گا۔ جہاں دن اور رات پہنچتے ہیں۔ "[۳۹]۔ یوں توآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری امت کو اس کا ذمہ دار بنایا تھا لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آج اس دین کی اجنبیت میں اہل مدرسہ کا کردار کتنا ہے؟ اس دین کی ساری خیر اور سارے منافع، خیر القرون ہی کے لیے مخصوص نہیں تھے۔ جس دورِ تاریخ اور جس زمانے کے انسان اس پر عمل اور اس کے نفاذ کی مطلوب کوششیں کریں گے، ہر اس دور اور زمانے کو اس برکات حاصل ہوں گی، نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق : "میری امت کی مثال باران رحمت کی سی ہے، نہیں معلوم کہ اس کے اول میں خیر ہے یا آخر میں۔ "[۴۰] اس دور فتن میں جو معاشرہ مدارس کی مالی ضروریات خوش دلی سے پوری کر رہا ہے، وہ اہل دین کی تعلیم پر بھی کان دھر سکتا ہے اگر داعی نمونہ عمل بنیں اور دین کی دعوت اخلاص، محبت اور حکمت کے ساتھ ان کے دلوں میں جا گزیں کرنے کے لیے اپنے اندر فکر مندی پیدا کریں۔ طبقہ ء نسواں اس تبدیلی کی تمہید ہو سکتا ہے۔

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا　　تیرا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

حواشی وحوالہ جات:

۱۔　سورۃ العلق ۹۶: ۳۔۵

۲۔　یونانیوں میں افلاطون، سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔ اس نے ایک مثالی ریاست کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس میں تعلیم و تعلم صرف حکماء اور اعلیٰ فوجی قیادت کے لیے ضروری ہے۔ ریاست کے باقی باشندوں کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ فلسفہ، الفرڈ ویبر، مترجم خلیفہ عبدالحکیم، ص ۸۴، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۷ء اسی طرح تاریخ فلسفہ ء یونان، نعیم احمد، ص ۱۴۱، علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور ۱۹۸۱،

(i)۔ ہندوؤں کے مطابق برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے ویدوں کا سیکھنا، سمجھنا، پڑھنا پڑھانا بس انھیں کی ذمہ داری ہے۔ منودھرم شاستر، ترجمہ ارشد رازی، ص ۳۷، نگارشات پبلشرز، لاہور ۲۰۰۷

(ii)۔ بنی لاوی حکم تورات کے مطابق منصب کہانت پر فائز تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کے دینی اور علمی مقام کے بارے میں، جو انھیں یہود میں حاصل تھا، بڑی دلچسپ معلومات، عہد نامہء قدیم سے اخذ کرکے لکھی ہیں۔ خیمہ ء عبادت میں میں صرف بنی لاوی داخل ہو سکتے تھے۔ یہود کو جس معاملے میں مشکل پیش آتی، کاہن اعظم تابوت کے پاس جا کر خدا کے فیصلے معلوم کرلیتا۔ مجرد تابوت کے سامنے حاضری حصول الہام کے لیے کافی تھی۔ یہ کاہن معصوم اور ملہم خیال کیے جاتے۔ اس

طریقے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنی لاوی "اربابا من دون اللہ " بن بیٹھے اور ان کے ہر قسم کے اوہام اور خیالات نے قانون کا درجہ حاصل کر لیا۔ (امین احسن اصلاحی، حقیقت شرک، ص ۶۷، مکتبہ انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۸۰)

۳۔ تدوین حدیث، سید مناظر احسن گیلانی، ۲۱۵ تا ۲۲۵، مکتبۃ العلم، اردو بازار، لاہور

۴۔ صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل، کتاب العلم، باب ھل یجعل للنساء یوما، حدیث/ دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض ۱۹۹۹ء

۵۔ الطبقات الکبریٰ، محمد بن سعد بن منیع، ۷/۹۶۲۔۳۱۷، داراحیاء، التراث العربی، بیروت۔ لبنان

۶۔ صحیح مسلم، مسلم بن حجاج، کتاب صلاۃ المسافرین۔ باب جامع صلاۃ اللیل۔ حدیث ۱۷۳۹ دارالسلام للنشر التوزیع ریاض ۲۰۰۰

۷۔ صحیح مسلم، مسلم بن حجاج، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب اثبات الحساب، حدیث ۷۲۲۵، ۷۲۲۷

۸۔ صحیح بخاری، حدیث ۱۲۸۶

۹۔ خواتین کے دینی مدارس کا قومی ترقی میں کردار، نورین خالدہ، (تحقیقی مقالہ ایم فل۔ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی) ۲۰۱۴، ص ۳۶

۱۰۔ ایضاً ص ۴۶

۱۱۔ برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ص ۱۶۷، شعبہ ء تصنیف وتالیف وترجمہ۔ کراچی یونیورسٹی، کراچی ۱۹۹۹ء

۱۲۔ شاہ ولی اللہ نے نجیب الدولہ کے نام اپنے مکتوب میں لکھا" اگر غلبہ ء کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کرسکے گی۔ " شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، خلیق احمد نظامی، ، ص ۲۳، ۲۲، اردو بازار لاہور۔ ۱۹۷۸ء

۱۳۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ص ۵۳۳، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۹۷

۱۴۔ [i] http://www.dailytimes.com.pk/business/03-Jun-2014/earning-2-a-day-60-19-population-live-below-poverty-line

۱۵۔ [i] Pakistan Economic Survey 2014-15,Economics and Social indicators, http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_15/Economic_Indicators.pdf retrieved 06 August 2015

۱۶۔ دینی مدارس میں تعلیم۔ کیفیت، مسائل ،امکانات، سلیم منصور خالد، ص ۱۶۳، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد۔ ۲۰۰۲ء

۱۷۔ صحیح مسلم، باب بیان ان الاسلام بدا غریبا، حدیث ۳۸۴

۱۸۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید شاہ ولی اللہ، ص ۱۰۱، شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۰ء

۱۹۔ دینی مدارس میں تعلیم۔ ص ۲۲۸، ۲۲۹

۲۰۔ اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ص ۱۱۵، پاکستان اسلامک ایجوکیشنل کانگرس۔ ۲۰۰۱ء

۲۱۔ الفوز الکبیر، شاہ ولی اللہ، ص ۴۳، ۴۴، قرآن محل، مولوی مسافر خانہ، کراچی، ۱۹۸۲ء

۲۲۔ القمر ۵۴: ۳۲

۲۳۔ العنکبوت ۲۹: ۳۵

۲۴۔ الحشر ۵۹: ۷

:۲۵ الحج ۲۲: ۲۸

۲۶۔ محاضرات فقہ، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ص ۶۶ تا ۷۰، الفیصل ناشران کتاب، اردو بازار، لاہور

۲۷۔ انفاس العارفین، شاہ ولی اللہ، ص ۸۳، شاہ ولی اللہ اکیڈمی۔ حیدر آباد، سندھ ۱۹۶۶ء

۲۸۔ صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل، کتاب الادب، حدیث نمبر ۶۱۲۶، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض، ۱۹۹۹ء

۲۹۔ دین میں ترجیحات، یوسف القرضاوی، ص ۲۳، ادارہ منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ ۲۰۰۸

۳۰۔ تفہیم القرآن، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ۱/۱۴۵، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۴ء

۳۱۔ ہمارا اسلام قبول کرنا، پروفیسر خالد حامدی فلاحی، ص ۲۳۲، منشورات، ملتان روڈ، لاہور۔ ۲۰۰۹ء

۳۲۔ الرّعد ۱۳: ۱۷

۳۳۔ http://www.unmillenniumproject.org/goals/gti.htm

۳۴۔ التفہیمات الالٰہیہ، شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد سندھ، ۱۹۶۶

۳۵۔ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، حدیث ۵۲۸

۳۶۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات، حدیث ۲۶۳۱،

۳۷۔ ابن ماجہ، کتاب الزھد۔ باب الامل والاجل، حدیث: ۴۲۳۱، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض ۱۹۹۹ء

۳۸۔ الترمذی،کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة،حدیث: ۲۶۸۲، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض ۱۹۹۹ء

۳۹۔ مسند احمد،احمد بن حنبل، حدیث ۱۶۵۰۹، تمیم الداری، ۵/۳/۷،دار احیاء التراث العربی، بیروت،۱۹۹۱ء

۴۰۔ الترمذی، باب مثل امتی مثل المطر، حدیث ۲۸۶۹